حیات سرمد (پر ایک نظر)

سید ابوالخیر مودودی (مرحوم)

تعارف

مولانا ابوالخیر مودودی (رحمتہ اللہ علیہ) برصغیر کی ان چند مسلم شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے اس دور انحطاط میں اپنے دہلوی خاندان کی علمی اور روحانی روایات کو زندہ رکھا' مولانا عربی' فارسی اور اردو کے ادبی و فکری سرمایہ سے آگاہ تھے' فلسفہ اور تصوف سے نہ صرف نظریاتی سطح پر گہرا لگاؤ تھا' بلکہ عملی طور پر بھی اس کا تجربہ رکھتے تھے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا صحیح معنی میں ایک مہذب دانش مند تھے' بہت کم بولتے' لیکن جو بولتے' اس میں گلوں کی خوشبو ہوتی اور ان کی بصیرت اور تجربہ کی معنویت ' مولانا وقار اور عزت نفس کی چلتی پھرتی تصویر تھے' چنانچہ انہوں نے اپنے دم واپس تک نہ تو کتاب سے قطع تعلق کیا اور نہ ہی حصول دنیا کے لیے دنیاداروں سے اپنے علم و داب اور وقار کا سودا کیا۔

مولانا اپنے قیام حیدر آباد (دکن) میں بڑے شاہانہ انداز سے رہتے تھے "شہر نگاراں" کے مولف نے لکھا ہے کہ:۔ (مولانا) کمرے میں داخل ہونے لگتے تو ملازم بڑھ کر چلمن اٹھاتا' مودودی صاحب صوفے پر بیٹھ جاتے اور اس احتیاط سے کہ شیروانی یا پاجامے پر کوئی شکن نہ پڑنے پائے۔ جیب سے رومال نکالتے تو سارا کمرہ عطر سے مہک اٹھتا ملازم پاندان سامنے رکھتا تو ابوالخیر صاحب پاندان کھول کر چاندی کی ایک نازک سی قینچی نکالتے' بڑی نفاست سے پان کے پتوں کی نوک پلک درست کرتے' تب پاندان کھلتا اور کیوڑے میں بسے ہوئے کتھے چونے کی ڈبیوں سے جن کی چمچیاں بھی چاندی کی ہوتی تھیں ' پان لگائے جاتے تھے بازاری پان کو وہ چھوتے تک نہ تھے" جب ایک مدت کے بعد یہی صاحب دوبارہ مولانا سے لاہور میں ملے تو لکھا:۔ چہرے کی آب و تاب زائل ہوچکی تھی اور افکار کی لکیریں ابھر آئی تھیں ' مگر اس خندہ پیشانی سے ملے' نہ زمانے کا شکوہ نہ احباب کا گلہ' وہی پرانی شان استغنا' وہی بے نیازی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے...... کتابیں پڑھتے ہیں' اور مگن رہتے ہیں نہ کسی سے ملتے ہیں نہ کہیں آتے جاتے ہیں'

لاہور کے قیام میں ان پر ایک ایسا وقت بھی آیا' جب انہیں اپنی والدہ ماجدہ کے

ساتھ گھر چھوڑ کر شاہ کمال کے مزار پر چار ماہ تک قیام کرنا پڑا' کھلے آسمان کے نیچے پیلو کا ایک درخت تھا جس کے سایہ تلے مولانا استراحت فرماتے۔ لیکن یہ مولانا کے حسن کردار کا اعجاز تھا کہ وقار اور عزت نفس نے مولانا کا ساتھ نہ چھوڑا' ستم یہ ہوا کہ مرحوم لیاقت علی خان کی حکومت کے ایک وزیر کراچی سے لاہور آئے اور سیدھے شاہ کمال کے مزار پر پہنچ کر مولانا کو وزارت اطلاعات میں ملازمت اور معقول تنخواہ کی پیش کش کی' وزیر موصوف کو اس بات کا علم تھا کہ مولانا اپنے چھوٹے بھائی (مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودی) کے سیاسی نقطہ نظر سے اختلاف رکھتے ہیں' مولانا نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا کیوں کہ وہ اس پیش کش کے "مضمرات" سے آگاہ تھے۔

ہماری تاریخ میں آیا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو تین عباسی حکمرانوں مامون' معتصم اور واثق کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھانے پڑے' لیکن امام احمد نے انہیں بڑی بہادری اور صبرو تحمل سے برداشت کیا اور ایک علمی مسئلہ میں حکمرانوں کی آمرانہ روش کے سامنے جھکنے سے برابر انکار کیا۔ جب متوکل باللہ حکمران ہوا تو اس نے کوشش کی اپنے پیشرو حکمرانوں کی زیادتیوں کی تلافی کرے۔ چنانچہ اس نے مختلف اوقات میں امام احمد کی خدمت میں کثیر رقم بھجوائی۔ لیکن آپ نے ہر بار اسے قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا: خدایا! یہ آزمائش (مال و دولت کی چمک) پہلی آزمائشوں سے کہیں زیادہ کڑی ہے" الغرض جب مولانا لاہور میں آئے' اس وقت زمانہ نے رنگ روپ بدل لیا تھا اور فقر وفاقہ نے مولانا کا گھر دیکھ لیا تھا' لیکن مولانا نے پورے سکون قلب سے قلم و کتاب سے اپنا پرانا رشتہ برقرار رکھا اور کسی آزمائش کو اپنی جمعیت خاطر اور پرانی وضع پر شب خون مارنے کی اجازت نہ دی' سچ یہ ہے کہ "غنچہ" سے "ذوق تبسم" کو کون چھین سکتا ہے۔

میری مولانا سے پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں ہوئی جب ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی اور ان کی کشتی حیات ساحل کے قریب پہنچنے والی تھی۔ ان سے میری یہ نیازمندی ان کے دم واپسیں (ستمبر ۱۹۷۹ء) تک جاری رہی اس عرصہ میں انہوں نے خاکسار کو جس لطف و کرم سے نواز' اس کی داستان تو کسی دوسرے وقت بیان کروں گا' یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ مولانا مرحوم نے عربی زبان کی کلاسیکی کتابیں اور اپنے غیر مطبوعہ مسودات کا ایک مجموعہ مجھے عنایت فرمایا' ان کا خیال تھا کہ میں شاید ان کی کتابوں اور مسودات سے استفادہ کرنے [illegible]۔ مولانا کے ان مسودات میں دو مسودے

منصور حلاج اور سرمد سے تعلق رکھتے ہیں مولانا جب کسی موضوع پر لکھتے تو مقدور بھر اس سے انصاف کرنے کی سعی کرتے' چنانچہ انہوں نے سرمد پر ۱۹۲۷ء پر پہلا مسودہ لکھا' پھر اس مسودے پر برابر ۱۹۷۷ء تک اضافہ کرتے رہے۔ چنانچہ جب کبھی انہیں سرمد پر کوئی نئی چیز مل جاتی' تو وہ مجھے اپنے ایک نوٹ کے ساتھ بھجوا دیتے۔ جس سے پتہ چلتا کہ مرور وقت کے ساتھ ساتھ اس خوں چکاں داستان (سرمد) کے بعض واقعات کے بارے میں ان کی رائے بدلتی رہی ہے۔ مثلاً" انہوں نے ۱۹۲۷ء میں لکھا کہ "سرمد کا قتل نہ تو مذہبی تھا اور نہ ہی سیاسی' بلکہ انتقامی تھا' لیکن انہوں نے ۱۹۷۷ء میں خاکسار کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں لکھا:۔

"شاگرد انہ التماس ہے (عجز و انکساری ملاحظہ ہو) کہ سرمد کا قتل نہ مذہبی تھا' نہ ہی انتقامی' سراسر سیاسی تھا' خون ناحق سے دارا شکوہ کا دامن بھی داغ دار ہے' اس نے سعداللہ خان کو محض اس وجہ سے قتل کردیا کہ وہ عالم گیر کی طرف مائل تھا' وہ عالم گیر کا استاد اور اتالیق ہونے کے سبب جانتا تھا کہ شاہ جہاں کے بیٹوں میں ملک داری کی صلاحیت وہی رکھتا تھا پھر داراشکوہ نے عالم گیر کو بھی قتل کرانے کی سعی کی' لیکن قضاء قدر کا فیصلہ عالم گیر کے حق میں تھا۔ مالک الملک جس کو چاہتا ہے ملک داری عطا کرتا ہے اور عالم اسباب میں اپنے فیصلے کو واقع کرنے کے سبب بھی پیدا کردیتا ہے'

سرمد کی داستان میں دو بنیادی کرزار دارا شکوہ اور عالم گیر بھی ہیں' مولانا نے ان دونوں غیر معمولی شخصیات کا بھی سنجیدہ مورخ کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ لیکن سرمد سے ان کے گہرے لگاؤ کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا فطری طور پر شعر و تصوف کا ذوق رکھتے تھے اور علمائے سوء اور اہل ریا سے بیزار تھے۔ سرمد کی الہامی شاعری میں مولانا کو اپنے جذبات اور خیالات کی تسکین کا سرو ساماں مل گیا۔ سرمد نے اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے دنیا کی بے ثباتی' اہل ہوس کی نفس پرستی' کعبہ و بت خانہ میں جمال مطلق کی جلوہ گری کی تصویر کھینچی ہے' مزید یہ کہ سرمد نے بڑی بہادری سے موت کا سامنا کیا' جب جلاد' بادشاہ اور اصحاب عمائم کے حکم پر سرمد کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا تو سرمد نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اپنا سر تلوار کے نیچے رکھ دیا اور کہا: تم جس صورت میں بھی میرے سامنے آؤ میں تمہیں پہنچانتا ہوں" مولانا کو سرمد کی یہ ادا اور جذب و مستی اور حکمت و معرفت میں ڈوبی ہوئی شاعری بہت پسند آئی۔ مولانا سرمد سے پہلے منصور حلاج کو پڑھ چکے تھے اور دیکھ چکے تھے' کہ سرمد نے

صدیوں کے بعد اپنا سر دے کر منصور کی روایت کو زندہ کردیا ہے منصور نے اپنے قاتلوں کو معاف کرتے ہوئے کہا تھا: خدایا! ان لوگوں کو معاف فرمادے اس لیے کہ اگر انہیں اس بات کا علم ہوتا جس کا مجھے ہے تو آج یہ لوگ میرے خلاف شور و غوغا نہ کرتے' اور اگر میری آنکھوں پر وہی پردہ ہوتا جو ان کی آنکھوں پر ہے۔ تو آج میں یہاں شہادت گاہ میں نہ ہوتا" حلاج اور سرمد کی یہی ادائیں تھیں جو مولانا کے دل میں اتر گئیں' چنانچہ وہ زندگی بھر حق پرستی اورانسان دوستی کا درس دیتے رہے اور نفرت حسد اور انتقام نامی چیز سے ناآشنا رہے۔

افسوس! ۱۹۷۹ء میں لاہور میں مولانا کی وفات سے تاریخ کا ایک عہد ختم ہوگیا۔ مولانا اپنی مجالس میں جو عموماً" رات کو جمتیں اور گئی رات تک جاری رہیں' عبداللہ عمادی' محمد علی جوہر' سید سلیمان ندوی' مناظر احسن گیلانی' حکیم محمد اجمل' مفتی کفایت اللہ دہلوی' مولانا عبدالسلام نیازی (دہلی کے شہرہ آفاق قلندر) ابو الکلام آزاد' سید ابوالاعلیٰ مودودی' جوش ملیح آبادی اور اس پایہ کے دوسرے اصحاب کے بارے میں ایسی باتیں سناتے جو ابھی تک بہت سے لوگوں کے علم میں نہیں ہیں' مثلاً" انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ابوالاعلیٰ (مولانا اپنے بھائی کو اسی نام سے پکارتے تھے) تصوف کے بارے میں ذہنی تحفظات رکھتے ہیں' لیکن لوگوں کو یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ ۱۹۳۰ء میں ابو الاعلیٰ نے حیدر آباد دکن کے ایک صوفی سید ذوقی شاہ سے تسخیر قلوب کا ایک ورد حاصل کیا تھا۔ اس ورد کی تکمیل پر ایک دنبہ بھی ذبح کیا گیا تھا۔

وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سید ذوقی شاہ صاحب اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے تعلقات پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مقدم الذکر نے ۱۹۴۲ء میں مولانا مودودی کے سیاسی و مذہبی افکار پر سنجیدہ تنقید کی۔ غرضیکہ جب مولانا ابوالخیر "موڈ" میں ہوتے تو اپنے دل ودماغ کے بعض گوشوں سے پردہ اٹھاتے اور دوستوں کو حقائق کا مشاہدہ کرنے کی اجازت دیتے۔ (ان محفلوں کی روئداد ایک دوسرے مقالہ پر لکھی جائے گی)

مقام مسرت ہے کہ ہم بتوفیق ایزدی مولانا مرحوم کے ایک مسودے کو شائع کررہے ہیں' سرمد آج بھی برصغیر کی ادبی زندگی میں اپنا مقام رکھتے ہیں' اور ان کے کلام کے منظوم ترجمے بھی شائع ہورہے ہیں' انگریزی میں ان کی رباعیات کا ترجمہ ادھر کئی سال پہلے شانتی نکیتن' بنگال سے شائع ہوا تھا۔ ہرچند سرمد اہل علم کی نگاہ میں اونچا مقام

رکھتے ہیں۔ تاہم ان کو مقبول عوام بنانے میں ابوالکلام آزاد کے آتشیں قلم نے تاریخی رول ادا کیا ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۰ء میں خواجہ حسن نظام کے پرچے ''نظام المشائخ'' میں حیات سرمد کے نام سے ایک مضمون شائع کیا' جس میں انہوں نے سرمد کے قتل کو سیاسی قتل قرار دیتے ہوئے لکھا:۔

''عالمگیر کی نظروں میں تو سرمد کا سب سے بڑا جرم داراشکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خون ریزیاں جو پولیٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں ۔ انہیں مذہب کی چادر میں اڑھا کر چھپایا گیا ہے'' سرمد کے قتل میں جن علمائے دربار نے حصہ لیا تھا' ان کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :۔

''اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصہ میں فقہاء کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتوؤں کا دامن گیر ہے ۔ اسلام کی تاریخ کو کہیں سے پڑھو سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ بادشاہ جب خونریزی پر آتا تھا تو دارالافتاء کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام کرتے تھے'' (۱)

داراشکوہ کی شخصیت پر مولانا آزاد لکھتے ہیں :۔ ''ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے (داراشکوہ) دشمن کا قبضہ رہا' اس لیے اصل تصویر پولیٹکل چالوں کے گردو غبار میں چھپ گئی' وہ ابتدا سے درویش دوست' اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا.... اس کے صاحب ذوق ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھالی تھی .... پروانہ کو تو شمع ڈھونڈنی چاہیے ' اگر صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے ' تو سوز طلبی میں کامل نہیں''۔

سرمد پر علمائے دربار کے فتوی کفر کا ذکر کرنے کے بعد مولانا آزاد لکھتے ہیں :۔ ''کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے ' اور وہ (سرمد) اس منارہ عشق پر تھا جہاں کعبہ و مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور جہاں کفر و ایمان کے علم یکساں لہراتے ہیں '' الغرض سرمد پر مولانا کا مضمون اپنے اچھوتے اسلوب بیان اور خیالات کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اور لوگوں میں سرمد دل چسپی سے پڑھا جانے لگا۔

اس مضمون کے بعد دہلی یا لاہور سے رباعیات سرمد کے جو بھی منظوم ترجمے یا متن

شائع ہوئے، ان میں مولانا کا مضمون شامل تھا ابھی حال ہی میں دہلی سے عرش ملسیانی نے رباعیات سرمد کا ایک منظوم ترجمہ، جو پہلے نغمہ سرمد، کے نام سے شائع ہوا تھا، شائع کیا ہے۔ اس میں سرمد پر نہ صرف مولانا کا پورا مضمون دیا گیا ہے بلکہ سرمد پر بھارت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر شرما کا فاضلانہ پیش لفظ بھی ہے۔

۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال مرحوم نے سید سلیمان مرحوم کے ایک مضمون منصور حلاج، پر سید صاحب کو خط لکھا تھا کہ ''ابھی ایک شہید اور باقی ہے کیا عجب اس شہید (سرمد) کے قتل کی بھی باری آجائے'' ہمیں یقین ہے کہ اگر آج علامہ زندہ ہوتے تو انہیں سرمد پر مولانا ابوالخیر کا مقالہ دیکھ کر مسرت ہوتی، ہم نے مولانا کے مقالہ میں جہاں کہیں کوئی ترجمہ یا تشریحی نوٹ لکھا ہے، اسے قوسین میں رقم کیا ہے۔

رشید احمد (جالندھری)

سرمد کے حالات جن کتابوں میں ملتے ہیں، ان میں سب سے قدیم کتاب ''دبستان مذاہب'' ہے، جس کا مصنف ۱۰۵۷ھ میں حیدر آباد (سندھ)[۴] میں اس سے ملا تھا۔ اس کے بعد عہد عالم گیری کے دو تذکرہ نویس، طاہر نصر آبادی (یا نصیر آبادی) اور شیر خان لودھی نے اپنے تذکروں میں اس کے قتل کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد اور دوسرے بہت متاخر زمانے کے تذکرے ہیں، اور بھی سرمایہ ہے، جو اب تک سرمد کے حالات زندگی کے بیان و تشریح میں کم و بیش استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس سب کے علاوہ ایک اور پرانی دستاویز ہے، یہ دستاویز بانکی پور کے مشہور مشرقی کتاب خانے کی ایک قلمی کتاب ''مجمع الافکار'' میں ہے۔ صاحب مجمع الافکار نے اس کو نواب معتمد خاں کی یادداشت سے نقل کیا ہے۔(۲)

معتمد خان شاہجہان کے دربار کا ایک مشہور امیر تھا۔ وہ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی جنگ میں دارا شکوہ کی طرف سے لڑتا ہوا ۱۰۶۸ھ میں مارا گیا (مآثر الامراء، ج ۳، ص ۵۱۱) اس لیے اس کا بیان ''متعصب اور ظاہر پرست'' اورنگ زیب کے عہد کی رنگ آمیزی سے خالی ہوگا، اور چوں کہ وہ دارا شکوہ کا طرف دار تھا اس لیے یہ شبہ نہ گزرے گا کہ دارا شکوہ کی دشمنی میں اس نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے۔